ڈاکٹر خالد ندیم
شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

مکتوباتِ مشاہیر میں ذکرِ اقبال

Dr. Khalid Nadeem

Department of Urdu, University of Sargodha, Sargodha

Discussion on Iqbal in the letters of Eminents

It is said that every aspect of Iqbal's art and thought is covered and there is no need for any further work in this field. But its also a fact that Iqbal's prose and poetry is not compiled acconrding to modern techniques of research and editing. What to talk of Iqbal's Urdu and Enghlish complete prose works, even no satisfactory translation of Iqbal's English letters, articles and speeches, so it is wrong to state that there is no need to do further work in this field.

The tradition initiated by Sheikh Abdul Qadir to comprehend Iqbal, is gradually strengthened and new possibilities and trends are introduced.

In Urdu, the tradition of literary letters writing is not old as compared to other genres. Letters of Ghalib is the first milestone in this regard. The possibilities of progression of this genre is gradually increasing. Critics often focus on style of Urdu letters, but given articles analysis the discussion about Iqbal in the letters of eminent personalities, their books and compilations, their art and thinking and related to Iqbal.

کہا جاتا ہے کہ اقبال کے فکر وفن کے تقریباً تمام موضوعات پر سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے اور اب مزید کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ ممکن ہے، یہ بات کسی حد تک درست ہو؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابھی تک تو اقبال کی نظم ونثر کو بھی جدید اصولِ تدوین کے مطابق مرتب نہیں کیا جا سکا۔ ان کے مکاتیب کو صحتِ متن کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکا۔ اسی طرح اردو اور انگریزی نثر کے مجموعے صحتِ متن کے ساتھ اور ڈھنگ سے مرتب نہیں ہو سکے، ''کلیاتِ نثرِ اردو'' اور ''کلیاتِ نثر انگریزی'' کی منزل تو بہت دُور ہے؛ ابھی تک انگریزی خطوط، نثری مضامین اور تقاریر کا کوئی معقول ترجمہ بھی سامنے نہیں آ سکا اور اسی طرح اقبال کی اردو نثر کا انگریزی ترجمہ بھی منتظرِ فردا ہے؛ چنانچہ یہ کہنا کہ اقبالیات میں تحقیق وتنقید کی گنجائش نہیں رہی، درست نہیں۔ اقبالیات کے سنجیدہ محققین و ماہرین ہمیشہ نئے نئے موضوعات پر کام کرتے رہے ہیں اور ان کی کاوشیں یہ ثابت کرتی

رہی ہیں کہ یہ سرچشمہ ابھی خشک نہیں ہوا، بلکہ یہاں سے پھوٹنے والی روشنی کتنے ہی زمانوں تک دنیاے علم وآگہی اور شعروادب کو منور کرتی رہے گی۔

تفہیم اقبال کا آغاز اقبال کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا۔ شیخ عبدالقادر کے مضمون (مطبوعہ خدنگ نظر لکھنؤ، مئی ۱۹۰۲ء) سے تاحال یہ روایت برابر آگے بڑھتی جارہی ہے اور ہر دَور میں اقبال شناسی میں نئے نئے رجحانات اور امکانات کا اظہار ہوتا آیا ہے۔

اردو میں مکتوب نویسی، بالخصوص ادبی مراسلہ نگاری دیگر اصناف کی نسبت کچھ ایسی قدیم بھی نہیں اور خطوطِ غالب سے اس صنفِ ادب کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ چونکہ اس صنف میں پھلنے پھولنے کے امکانات موجود تھے، چنانچہ مکتوب نگاری کا یہ سلسلہ سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، نذیر احمد دہلوی، محمد حسین آزاد، اکبر الہ آبادی، ابوالکلام آزاد، علامہ محمد اقبال، مولوی عبدالحق، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی، غلام رسول مہر، ابوالاعلیٰ مودودی اور رشید احمد صدیقی سے ہوتا ہوا مشفق خواجہ تک آپہنچا ہے۔

اردو مکتوبات کے سلسلے میں ناقدین کی نظر بالعموم اسلوب پر رہی ہے یا زیادہ سے زیادہ مکتوب نگاروں کے نفسیاتی تجزیے کی کوشش کی گئی ہے، البتہ مکتوبات کا موضوعاتی مطالعہ بہت کم ہوا ہے۔

اقبال کی زندگی میں یا اس کے بعد مشاہیر کی علمی وادبی تحریروں میں بالعموم اور نجی تحریروں، یعنی روزنامچوں اور خطوں میں بالخصوص توصیف وتنقیصِ اقبال کا سلسلہ جاری رہا ہے، چنانچہ اردو مکاتیب کا کوئی مجموعہ اٹھا کر دیکھ لیجیے، اس میں کسی نہ کسی حوالے سے اقبال کا ذکر ضرور مل جائے گا، مگر چونکہ مشاہیر کے خطوط کا دائرہ بے حد وسیع ہو چکا ہے اور یہاں مقالے کی تنگ دامانی اختصار کا تقاضا کر رہی ہے، چنانچہ فی الوقت چند مشاہیر کے منتخب خطوں سے اقبال کی سوانح وشخصیت، نثر ونظم اور فکر وفن کے محض چند پہلوؤں پر بات ہوسکتی ہے۔

(۱)

حیاتِ اقبال کے ضمن میں اقبال کی تاریخ پیدائش ایک نزاعی مسئلہ رہا ہے۔ پاکستان میں اقبال صدی کے موقع پر حکومتِ پاکستان کی طرف سے قائم کردہ کمیٹی نے اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کا تعین کر دیا تھا، البتہ اس سے قبل فقیر سید وحیدالدین بھی اسی تاریخ پر اصرار کرتے رہے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں لکھے گئے اپنے ایک خط میں مولانا غلام رسول مہر نے بلدیہ سیالکوٹ کے ریکارڈ کے مطابق فروری ۱۸۷۳ء کو اقبال کی درست تاریخ پیدائش قرار دیا تھا۔ ان کے خیال میں، اقبال نے بیس برس کی عمر میں ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا امتحان دیا۔ مہر کا استدلال تھا کہ اقبال پہلے کسی مکتب میں قرآنِ مجید پڑھتے تھے، چنانچہ انھوں نے خاصے بڑے ہوکر باقاعدہ تعلیم شروع کی،[1] لیکن پروفیسر آلِ احمد سرور ۴ ستمبر ۱۹۷۸ء کو لکھتے ہیں کہ تاریخ پیدائش کے سلسلے میں تمام شواہد دسمبر ۱۸۷۳ء کی طرف جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پی ایچ ڈی کے مقالے کے سلسلے میں انھوں نے جو سنہ لکھا ہے، وہ سرکاری عمر ظاہر کرتا ہے۔[2] اس سلسلے میں انھوں نے نقوش کے اقبال نمبر (۲) میں مطبوعہ ڈاکٹر وحید قریشی کے مضمون اور اقبال درُون خانہ میں خالد نظیر صوفی کے استدلال کا بھی ذکر کیا ہے۔

سر فضل حسین کے بیٹے عظیم حسین نے اپنی انگریزی کتاب *Sir Fazl-i-Hussain:A Political Biography* میں لکھا کہ فضلِ حسین ہمیشہ ڈاکٹر اقبال کی اعانت کرنے کی کوشش کرتے رہے، مگر ڈاکٹر اقبال مواقع ملنے پر بھی ان سے فائدہ اٹھانے سے قاصر رہے۔[3] ڈاکٹر جاوید اقبال نے عظیم حسین کے اس بیان پر دلچسپ تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ جس قسم کا سیاسی

مستقبل اقبال کے لیے سر فضل حسین تجویز کرتے رہے، وہ انھیں زیادہ سے زیادہ ایک اَور سر فضل حسین یا سر ظفر اللہ خاں بنا دیتا؛ ایسی صورت میں وہ اقبال ہرگز نہ رہتے۔[۴] پروفیسر آلِ احمد سرور نے عظیم حسین کی اس کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ [۱۹۲۴ء میں] فضل حسین، اقبال کو لاہور ہائی کورٹ کا جج بنانے کے لیے کوشاں تھے، مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ سرور کے خیال میں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سیاست میں انہماک اور قانونی پیشے پر توجہ کم ہونے کی وجہ سے ان کی ججی کی مخالفت اعلیٰ حلقوں میں ہوئی ہو۔[۵] سرور اصل حقیقت کو مدِنظر نہ رکھ سکے کہ ہائی کورٹ کی ججی میں اصل رکاوٹ اقبال کی شاعرانہ یا علمی سرگرمیاں نہیں، بلکہ صرف اور صرف چیف جسٹس سر شادی لال کا تعصب تھا۔

۱۹۲۶ء میں علامہ اقبال پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں بطور امیدوار میدان میں اترے۔ ان دِنوں کی یادیں تازہ کرتے ہوئے حکیم عبدالکریم ثمر ۲۶ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ء (۲۴ ری ۱۹۷۹ء) کو تحریر کردہ ایک خط میں بعض تفصیلات سے آگاہ کرتے ہیں:

> حضرت علامہ اقبال جب پنجاب کونسل کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تو لاہور میں مجلس انتخاب تجویز کی گئی، جس کے اراکین ملک لال دین قیصر، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، مولوی محمد بخش مسلم وغیرہ تھے۔ انتخابی سلسلے میں لاہور کے بڑے بازاروں اور بیرونی باغات میں حضرت علامہ کے اعزاز [میں] جلسے ہوتے رہے، جن میں حضرت علامہ بھی بنفس نفیس تشریف لاتے اور اپنے خیالاتِ عالیہ کا اظہار بھی فرماتے، دیگر اکابرین کی تقریریں ہوتیں۔ مسلم صاحب اسرارِ خودی کے اشعار لحنِ داؤدی میں سناتے، دیگر شعرا اور راقم بھی حضرت کی شخصیت پر نظمیں پیش کرتے۔[۶]

حکیم ایشیا، حکیم محمد حسن قرشی کی زیرِ صدارت انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے سالانہ اجلاس میں ایک نعت خواں نے مولانا احمد رضا بریلویؒ کا کلام پڑھا، جس کا شعر تھا:

بہم عہد باندھے ہیں وصلِ ابد کا
رضائے خدا اور رضائے محمدؐ[۷]

حکیم عبدالکریم ثمر بتاتے ہیں کہ اسی جلسے میں حضرت علامہ نے اپنی تقریر سے پہلے دو شعر ارشاد فرمائے، جو آج تک میرے ذہن میں ہیں:

تماشا تو دیکھو کہ دوزخ کی آتش — لگائے خدا اور بجھائے محمدؐ
تعجب تو یہ ہے کہ فردوسِ اعلیٰ — بنائے خدا اور بسائے محمدؐ[۸]

پروفیسر حمید احمد خان (م ۱۹۰۳ء-۱۹۷۴) نے ماہ نامہ اردو ڈائجسٹ کے شمارے اپریل ۱۹۶۴ء میں 'زندہ اقبال' کے نام سے ایک فیچر میں ان کی بینائی پر تبصرہ کیا تو مولانا غلام رسول مہر نے ایک خط میں لکھا:

> پروفیسر حمید احمد خاں حضرت علامہ سے غالباً اُس زمانے میں مِلے، جب ان کی ایک آنکھ میں سفیدی آرہی تھی اور آخری دَور میں اس آنکھ کی نظر بند ہوگئی تھی، بلکہ دوسری آنکھ بھی کمزور ہوگئی تھی۔ صحت کی خرابی کے باعث وہ آپریشن کرا نہیں سکتے تھے۔ لیکن صحیح یہ نہیں کہ ان کی ایک آنکھ کی نظر شروع سے ختم تھی۔ مَیں نے ان سے پہلی ملاقات ۱۹۲۲ء کے اواخر یا ۱۹۲۳ء کے شروع میں کی تھی اور گھنٹوں ان کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا، کبھی وہ کیفیت نہ دیکھی، جس کا ذکر حمید احمد خاں صاحب نے کیا۔[۹]

بقول غلام رسول مہر، مصیبت یہ ہے کہ مختلف اصحاب اپنی دیکھی ہوئی حالت کو صرف حال و مستقبل تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ ماضی پر بھی حاوی کر دیتے ہیں۔ حضرت کی ایک آنکھ کی نظر کمزور ضرور تھی، اس لیے پڑھتے وقت عینک لگا لیتے تھے۔ کاملاً بندشِ نظر کا معاملہ میرے علم سے باہر ہے۔[10]

۱۳ر جون ۱۹۳۷ء کو سر اکبر حیدری کے نام ایک خط میں اقبال نے لکھا تھا:

..... In my declining years, when my life work is practically finished. The only desire that is still pinching me is to make a pilgrimage, if possible to Mecca and from there to the grave of him whose infinite devotion to God has been a constant source of inspiration and consolation to me.[11]

اقبال کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے ۴ر ستمبر ۱۹۷۸ء کے ایک خط میں پروفیسر آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

> اقبال، اکبر حیدری پر اپنے مالی حالات اور حج بیت اللہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کا اشتیاق ظاہر کر کے یہ توقع کرتے تھے کہ سر اکبر حیدری اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھائیں گے۔[12]

حقیقت یہ ہے کہ آخری دَور میں اقبال اور اکبر حیدری کے تعلقات ایسے نہیں رہے تھے کہ اقبال، اکبر حیدری سے مالی اعانت کے خواہاں ہوتے یا اس کی توقع رکھتے۔ یہ محض سرور کا قیاس ہے کہ علامہ، اکبر حیدری سے مالی اعانت کے خواست گار تھے۔ آخری زمانے میں اقبال کی صحت ہرگز ایسی نہ تھی کہ وہ حج بیت اللہ کا ارادہ کرتے۔

(۲)

اقبال کا وہ کلام، جو ان کے کسی مجموعۂ کلام میں بار نہ پا سکا؛ مولانا غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری نے ترتیب و تحشیہ کے بعد کتاب منزل لاہور سے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ محترم محمد عالم مختارِ حق نے سرودِ رفتہ میں بعض تسامحات کی نشان دہی کی تو مولانا مہر نے شریک مرتب اور لتھو کی چھپائی کے مختلف مراحل میں کاتب اور سنگ ساز کی بعض کوتاہیوں کے باوجود خود کو بری الذمہ قرار نہیں دیا اور بتایا:

> جس زمانے میں زبورِ عجم زیرِ تصنیف تھی، مرحوم ڈاکٹر صاحب تقریباً روزانہ ایک دو غزلیں سنایا کرتے تھے یا دوسرے تیسرے دن۔ یا تو وہ خود بلا لیتے تھے، کیوں کہ مَیں ان کے دولت کدے (واقع میکلوڈ روڈ) سے قریب رہتا تھا یا مَیں اور چودھری محمد حسین مرحوم روزانہ شام کے وقت حاضر ہو جاتے تھے۔ جب کوئی غزل ہو جاتی تو فرما دیتے کہ تم لوگ ذرا ٹھہر جاؤ، کام ہے۔[13]

مولانا مہر کا طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ سنتے، ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ گھر پہنچتے تو حافظے پر زور دے کر نقل کر لیتے۔ کہتے ہیں کہ بیش تر چیزیں پوری کی پوری نقل ہو جاتیں، بعض مصرعے ذہن سے اتر جاتے تو ان کی جگہ نقطے لگا دیتا۔[14] پھر یوں ہوا کہ وہ کاپی ان سے گم ہو گئی اور سرودِ رفتہ کی اشاعت کے بہت عرصے بعد ملی؛ جس کی اطلاع دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ وہ کاپی میرے کاغذوں میں سے نکل آئی۔ مقابلہ کیا تو بعض اشعار مطبوعہ کتاب سے خارج ہو گئے، بعض میں خاصی ترمیم کر لی گئی، بعض اشعار کی ترتیب بدل لی گئی، چنانچہ مَیں اب یہ اشعار بھی دلاوری صاحب کے حوالے کر رہا ہوں۔ ممکن ہے، کچھ اَور چیزیں بھی ہوں،[15] لیکن بدقسمتی سے اس کتاب کا نظر ثانی شدہ اڈیشن کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔

اقبال اپنے کلام کے میں ترمیم وتصحیح کا عمل جاری رکھتے تھے، چنانچہ پہلی کاوش سے مجموعۂ کلام میں شمولیت تک ان کی تخلیقات کئی مراحل سے گزرتیں۔ ایک ایسی ہی صورتِ حال کی طرف جگن ناتھ آزاد نے اشارہ کیا ہے۔ آزاد ۱۵؍جنوری ۱۹۸۳ء کو لکھے گئے ایک خط میں استفسار کرتے ہیں:

> علامہ اقبال کا اصل مصرع یوں ہے.....'نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم'، لوگ اسے یوں پڑھتے ہیں.....'نشانِ مردِ مومن با تو گویم'..... یہ تبدیلی کیسے رونما ہوئی؟ علامہ نے یہ رباعی کب دہرائی؟ کن لوگوں کے سامنے؟ (غالباً اپریل ۳۸ء کے شروع کی بات ہے) یہ کس کا بیان ہے کہ علامہ مرحوم نے انتقال سے چند روز قبل یہ رباعی پڑھی تھی؟ [۱۶]

یہاں چراغ حسن حسرت کے مرتبہ اقبال نامہ میں شامل مولانا غلام رسول مہر کی اس روایت کا پیش کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مہر لکھتے ہیں کہ ۷ مارچ [۱۹۳۸ء] کی شام مَیں اور سالک حاضرِ خدمت ہوئے تو بظاہر ان کی طبیعت کسی قدر بہتر معلوم ہوتی تھی۔ وہ خود فرمانے لگے: 'اب تو مَیں کمرے کے اندر تھوڑا سا چل پھر بھی لیتا ہوں'۔ ہم نے عرض کیا: 'خدا کے فضل سے چند روز میں اتنی صحت ہو جائے گی کہ آپ کوٹھی کے صحن میں چہل قدمی فرما لیا کریں گے'۔ مسکرا کر کہنے لگے: 'مَیں موت سے نہیں ڈرتا، بلکہ خندہ پیشانی کے ساتھ اس کی پیشوائی کے لیے تیار ہوں'۔ ساتھ ہی اپنا یہ شعر سنایا:

نشانِ مرد مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست [۱۷]

چونکہ ان سوالات کا باقاعدہ جواب دینے کی کبھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی، اس لیے بعض مصرعوں، بعض شعروں اور بعض نظموں کے بارے میں اقبالیات کے طالب علموں کے سامنے ایسے استفسارات آتے رہتے ہیں۔ دراصل دنیاے اردو کا یہ ایک المیہ ہے کہ جہاں تمام اہم شعرا کے دواوین مختلف اوقات میں نامور مدوّنین نے مرتب کیے، اقبال کے اردو یا فارسی کلام کو جدید تدوینی طریقِ کار کے مطابق شائع کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ ۱۱؍مئی ۱۹۹۳ء کے ایک خط میں رشید حسن خاں نے لکھا:

> دو ہفتے قبل یہاں انجمن ترقی اردو کی طرف سے اقبال سیمینار ہوا تھا۔ مَیں نے بھی اس میں ایک مختصر سا پرچہ پڑھا تھا، عنوان تھا: کلامِ اقبال کی تدوینِ جدید کی ضرورت۔ آغاز کی سطر یہ تھی: ہم کو فراخ دِلی کے ساتھ یہ بات مان لینا چاہیے کہ کلامِ اقبال کا کوئی ایسا مجموعہ اب تک مرتب نہیں ہو سکا ہے، جسے اصولِ تدوین کے مطابق معیاری اور مثالی کہا جا سکے۔ [۱۸]

۱۷؍جون ۱۹۹۳ء کو رشید حسن خاں نے اسی مسئلے کو چھیڑا اور کہا:

> واقعتاً افسوس کا مقام ہے کہ آج تک کلیاتِ اقبال اصولِ تدوین کے مطابق مرتب نہیں کیا جا سکا، جس طرح مثلاً دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ہے۔ [۱۹]

اس مسئلے کی شدت میں اُس وقت اضافہ ہو گیا، جب رشید حسن خاں نے اقبال اکادمی کے مرتبہ کلیاتِ اقبال اردو کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کیا تو اس وقت کے ناظمِ اقبال اکادمی نے انھیں بتایا کہ تدوین کا کام دفتری عملے نے انجام دیا اور اُنھی پر اس کی ذِمے داری عائد ہوتی ہے۔ یہ بھی لکھا کہ میرے زمانے میں چار اڈیشن شائع ہوئے۔ اس پر رشید حسن خاں نے شدید ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے ۳۱؍جولائی ۲۰۰۵ء کو اپنے ایک خط میں لکھا کہ آج تک ایسا کہیں نہیں ہوا ہوگا کہ اتنے بڑے ادارے میں تدوین کا کام 'دفتری عملہ' انجام دے اور ناظم صاحبان تنخواہ لیتے رہیں اور صاد کرتے رہیں۔ یا للعجب۔ [۲۰]

اسی عرصے میں ڈاکٹر خلیق انجم نے رشید حسن خاں سے کلیاتِ اقبال کی تدوین کی درخواست کی، جس کے جواب میں انھوں نے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو شریک مدوّن بنانے کی شرط عائد کر دی۔ خلیق انجم نے ڈاکٹر ہاشمی کو ۱۲/اگست ۲۰۰۵ء کو ایک خط میں اس صورتِ حال سے آگاہ کیا:

> خاں صاحب کی تجویز مجھے بہت پسند آئی، اس لیے مَیں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ ابھی تک کلیاتِ اقبال کا کوئی ایسا نسخہ شائع نہیں ہوا، جس پر پوری طرح اعتماد کیا جا سکے۔ اگر آپ اور خاں صاحب مل کر اسے مرتب کریں تو یقیناً اقبالیات کی یہ کمی پوری ہو جائے گی۔..... ترتیب کی ذمہ داری آپ دونوں کی ہے اور اس کلیات کو بہت خوب صورت شائع کرنا انجمن ترقی اردو کا کام ہوگا۔[۲۱]

ڈاکٹر ہاشمی نے رضامندی کے اظہار کے ساتھ ناسازیِ صحت کا ذکر کیا تو رشید حسن خاں نے منصوبے کے عملی پہلوؤں پر توجہ دِلائی:

> دیکھیے پیر جی! صحت میری بھی ناقابلِ اعتبار ہے، زیادہ وقت اور فرصت میرے پاس بھی نہیں۔ معلوم نہیں، کب بلاوا آ جائے، اس لیے تدوین میں معیار کے ساتھ ساتھ عملی پہلو کو بھی ہم دونوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ یہ میری دِلی خواہش ہے اور آپ اس میں شریکِ غالب کی حیثیت رکھتے ہیں کہ یہ کلیات مرتب ضرور ہو اور شائع بھی ہو۔ یہ گویا ہندستان اور پاکستان، دونوں ملکوں کی طرف سے اعتراف نامہ ہوگا اور اس کی ایک تاریخی حیثیت ہوگی، یوں اس کام کو بہرطور مکمل کرنا ہے۔[۲۲]

اردو دنیا کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائیے کہ ۱۲/دسمبر ۲۰۰۵ء کے اس خط کے محض اڑھائی ماہ بعد، یعنی ۲۶/فروری ۲۰۰۶ء کو رشید حسن خاں اللہ کو پیارے ہو گئے اور یوں یہ عظیم منصوبہ روبعمل نہ ہو سکا۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں معاشیات کے استاد شیخ عطاء اللہ کا مرتبہ اقبال نامہ لاہور کے ناشرانِ کتب شیخ محمد اشرف نے ۱۹۴۵ء میں شائع کیا۔ ۳/اگست ۱۹۸۲ء کے خط میں ڈاکٹر صابر کلوروی، اقبال نامہ میں راس مسعود کے ایک خط کے بعض حصوں کے حذف ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> یوں لگتا ہے کہ ایک دفعہ اس نسخے کی مارکیٹ میں آمد کے بعد چودھری محمد حسین کو اعتراض ہوا ہو اور پبلشر نے تمام نسخے واپس منگوا کر اُن سے قابلِ اعتراض مواد خارج کر کے دوبارہ مارکیٹ میں بھیجا ہو..... تاہم یہ بات ثابت ہے کہ معاملہ وظیفے کا تھا اور جن الفاظ میں اس کی درخواست کی گئی تھی، اسے اقبال کے شایانِ شان نہیں سمجھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں ایک اَور خط سے، جو مولوی عبدالحق کے نام لکھا گیا تھا، ایک پورا پیرا گراف اقبال نامہ جلد دوم میں حذف کر دیا گیا تھا۔[۲۳]

یہاں علامہ کے مذکورہ خط (مرقومہ ۹/ستمبر ۱۹۳۷ء) کا حذف شدہ حصہ پیش کرنا دلچسپی کا باعث ہوگا۔ مولوی عبدالحق کے نام اس خط میں علامہ لکھتے ہیں:

> آپ کو یاد ہوگا کہ کسی گذشتہ خط میں آپ نے مجھے لکھا تھا کہ 'مجھے اپنے دنیاوی افکار سے مضطرب نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس اضطراب کو اپنے احباب کے لیے چھوڑ دینا چاہیے'۔ کیا اس معاملے میں آپ نے کوئی عملی اقدام کیا؟ اگر اب تک نہیں کیا تو مَیں سمجھتا ہوں کہ اس وقت موقع ہے، کیونکہ سر اکبر حیدری نے اپنے گذشتہ خطوں میں امید دِلائی ہے یا ایسے اشارات کیے ہیں، جن سے امید بندھتی ہے۔[۲۴]

غالباً انھی وجوہ کی بنا پر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ایک خط کے ذریعے ڈاکٹر جاوید اقبال کو علامہ اقبال کے مکاتیب کے کلیات کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے نے ۴/اکتوبر ۱۹۷۶ء کے مراسلے میں لکھا:

> مجھے آپ کی راے سے اتفاق ہے کہ مکتوباتِ اقبال کا ایک جامع اڈیشن تاریخ وار اور ضروری حوالوں کے ساتھ شائع ہونا چاہیے۔ اب تک تو یہ مواد منتشر ہے اور بعض مقامات پر تشریح نہیں دی گئی، اس لیے مکتوب الیہ کے متعلق معلومات کے بارے میں تشنگی رہ جاتی ہے۔[۲۵]

بعدازاں اگرچہ سید مظفر حسین برنی نے اقبال کے مکاتیب کا کلیات مرتب کر دیا، لیکن وہ کئی ایک مقامات پر ٹھوکر کھا گئے۔ خطوط کو نقل کرنے اور تراجم کے معاملے میں وہ ایک مدوّن کے فرائض سے چشم پوشی کر گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید مظفر حسین برنی کے مرتبہ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال میں تدوین کے عالمی معیارات کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ یہاں محض ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ میجر سعید محمد خاں کے نام اقبال کا ایک انگریزی خط کا متن ملاحظہ فرمایئے:

> Many thanks for your letter. To name a military school after a mere versifier does not seem proper.I suggest that you name your school after Sultan Tipu. The grave of this brave soldier, as I saw in South India, looked more aive than many of us who live or pretend to live.[۲۶]

اب اس متن کا ترجمہ دیکھیے، جو اقبال نامہ کے مرتب شیخ عطاء اللہ نے کیا اور جسے ہو بہو سید مظفر حسین نے اپنے کلیات میں شامل کیا۔

> (ترجمہ): ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی سکول کا موسوم کرنا کچھ زیادہ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ مَیں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس فوجی سکول کا نام 'ٹیپو فوجی سکول' رکھیں۔ ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا، جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں، جیسا کہ مَیں نے خود مشاہدہ کیا ہے، اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے، جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔[۲۷]

آپ نے دیکھا کہ خط کے ابتدائی جملے Many thanks for your letter کا ترجمہ نہیں کیا گیا، اس پر ستم یہ کہ ترجمے میں یہ جملہ متن سے زیادہ ہے، یعنی..... ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا، جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے..... اگرچہ اقبال کے جملہ مکتوبات کی تدوین برنی صاحب کا قابلِ ستائش کارنامہ ہے، لیکن اس پر نظرِ ثانی کی بے حد ضرورت ہے۔

(۳)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب علامہ اقبال: شخصیت اور فن پر راے دیتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال نے مصنف کے نام ایک خط میں لکھا کہ حیاتِ اقبال کا مطالعہ ان کی فکر اور فن کی ارتقا کی روشنی میں کیا گیا ہے، تاہم انھوں نے یہ بھی لکھا:

> ان کی فکر میں الجھاؤ کے بارے میں جو اعتراضات بعض تبصرہ نگاروں نے کیے ہیں، ان کا جواب نہیں دیا گیا؛

مثلاً گب سمجھتا ہے کہ اقبال کے فکری تضادات اور ابہام کے باعث مسلمانوں میں اندرونی نظریاتی تصادم، روحانی غیر یقینی اور عدم استحکام کا عالم اسی طرح قائم رہا۔ سمتھ انھیں 'قدامت پسند لبرل' قرار دیتا ہے، جو فکری طور پر تو تجدید کا قائل ہے، مگر عملی طور پر تجدید سے خوف زدہ ہے۔ فضل الرحمٰن کے نزدیک، اقبال کی فکری میراث صرف مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کے قیام کی تجویز ہے؛ وہ نہ تو دینیات کے ماہر تھے، نہ قرآن کے سکالر۔ حسین نصر ان کی فکر میں محبت اور نفرت کی کشاکش پاتا ہے، یعنی رومی کو پسند کرتے ہیں، حافظ کو ناپسند۔ [اقبال] اپنے آپ کو جدید بیّن میں شمار کرتے ہیں، لیکن ان کی ارتقائیت قرآن وحدیث کی تعلیمات سے متصادم ہے۔ ۲۸

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ ان اعتراضات اور میری رائے میں ایسے مزید کئی اعتراضات کا جواب دینا ضروری ہے، خصوصی طور پر ایسی کتب میں، جن میں علامہ کی شخصیت کا مطالعہ ان کی فکر اور فن کے ارتقا کی روشنی میں کرنا مقصود ہو۔ ۲۹

حضرو میں مقیم ملک حق نواز خاں اگرچہ باقاعدہ ادیب یا نقاد نہیں، تاہم وہ ایک علمی شخصیت کے مالک ہیں اور غالبیات اور اقبالیات سے شغف رکھتے ہیں، بالخصوص اقبال سے متعلق ہونے والے کام پر ان کی گہری نظر ہے۔ یکم دسمبر ۲۰۰۳ء کے ایک خط میں انھوں نے تین نکات پر گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

(۱) اقبال کی نظم 'التجاے مسافر درگاہِ حضرت محبوبِ الٰہی دہلی' کا ایک شعر ہے:

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی　　مسیح وخضر سے اونچا مقام ہے تیرا

اس شعر میں اگرچہ (بقول ماہر القادری مرحوم) خضر کی حیثیت متعین نہیں، لیکن مسیح تو پیغمبر ہیں اور اس لیے کسی بھی ولی اللہ کا مرتبہ پیغمبر سے اونچا نہیں ہوسکتا۔

(۲) خطبات میں جنت اور دوزخ کا علامہ کا تصور مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوزخ اور جنگ دراصل احوال ہیں، مقامات نہیں۔ (states not places)۔ ابلیس وآدم کی کہانی کو تمثیلی کہتے ہیں، یعنی یہ کوئی واقعی چیز نہیں ہے۔ پھر خدا کے علم کے متعلق کل یوم ھو فی شان [سورۂ رحمٰن] کے حوالے سے ان کا نظریہ کہ اللہ تعالیٰ کا پہلے سے یہ علم نہیں ہوتا کہ کل آنے والے لمحات میں وہ کیا کرتے گا۔ یہ سب نظریات جمہور کے نظریات کے خلاف ہیں۔ اگرچہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم نے ان نظریات کا اقبال کے حوالے سے دفاع کیا ہے، لیکن ان کے دلائل کچھ دل کو لگتے نہیں ہیں۔

(۳) اب مَیں ایک دلچسپ بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ علامہ نے اپنی کتابوں میں کچھ ایسی احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے یا ان کو quote کیا ہے، جو موضوعات کے زمرے میں آتی ہیں..... خدا جانے علامہ نے یہ احادیثِ موضوعہ کہاں سے حاصل کی، اس پر تحقیق ہونی چاہیے۔ ۳۰

اقبال کے بارے میں داؤد رہبر نے اپنے ایک خط مرقومہ ۲ر فروری ۲۰۰۹ء میں اعتراف کیا کہ مرحوم کی زندگی بھرپور تھی۔ پھر ان کی صلاحیتوں کا ذکر کیا، مثلاً سخن وری، خوش گفتاری، علم دوستی اور ذہنی توانائی، رقت، گرمیِ طبع، درویشی۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ اعتراض بھی کرتے ہیں:

(۱) علامہ اور مہاتما گاندھی کی عظمت غیر منقسم ہندوستان کی شان تھی۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ یہ بزرگ ۱۹۴۷ء کے بعد کی اندھیر نگری سے وابستہ نہ ہو پائیں کہ اس سے نپٹنا ان کے بس کی بات نہ ہوتی۔

(۲) اقبال اگر پندرہ بیس سال اَور زندہ رہتے اور دوسری جنگ عظیم کی ہولناک خبریں سنتے اور اس جنگ کے تہ و بالا کرنے والے نتائج کو دیکھتے تو جرمنی سے ان کے لگاؤ میں کیا خلل پیدا ہوتا۔

(۳) پاکستان کے لوٹ کھسوٹ والے ابتدائی برسوں کے حالات پر وہ اپنی نظم و نثر میں کیا تبصرہ فرماتے۔[۳۱]

حیرت ہے کہ داؤد رہبر قیاسات سے عبرت حاصل کرتے ہیں، حالانکہ علامہ کی زندگی میں بھی عالمی و ملکی سیاسی حالات مدوجزر کا شکار رہے اور علامہ ہر قسم کے واقعات کو اپنے فکری تناظر میں سمجھتے اور ان پر رائے قائم کرتے رہے، اس لیے یہ مفروضہ قطعاً غلط ہے کہ اگر وہ مزید زندہ رہتے تو ان حالات کا تجزیہ نہ کر پاتے۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ وہ جب تک زندہ رہے، ان کی فکر ارتقائی منازل طے کرتی رہی یا جامد ہوگئی؟ اور ظاہر ہے کہ اقبال اسرار خودی سے ارمغان حجاز تک جن ذہنی و روحانی مراحل سے گزرے، وہ تمام کے تمام اقبال کے فکری تجربے کا حصہ بنے، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال زندگی اور تاریخ کے ہر نئے موڑ پر تازہ تخلیقی قوتوں کا اظہار کرتے رہے۔

اسی خط میں داؤد رہبر کا یہ ارشاد بجا ہے کہ خودی کے ڈسپلن کا تصور اس قدر بلند ہے کہ وہ غیر معمولی خداداد قابلیتوں کا متقاضی ہے۔ وہ قابلیتیں، جو اقبال کو مبداءِ فیاض سے عطا ہوئی تھیں، اوسط درجے کے مومنین اس ڈسپلن کی راہ پر قدم زن نہیں ہو سکتے،[۳۲] لیکن ان کا یہ ارشاد بحث طلب ہے کہ علامہ کو ساری نوعِ انسان کا شاعر نہیں کہا جا سکتا، آپ صرف ملتِ اسلامیہ کے شاعر ہیں۔ انھیں شاعرِ مشرق کہنا بھی ایک لحاظ سے نامناسب ہے، اس لیے کہ مرحوم کا دھیان چین کے شاندار تمدن کی طرف کبھی منعطف نہیں ہوا۔[۳۳]

مکتوب نگار کی یادداشت سے غالباً اقبال کی نظم 'ساقی نامہ' محو ہوگئی، جس میں علامہ فرماتے ہیں:

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بے زار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری، گیا — تماشا دِکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے[۳۴]

داؤد رہبر اُس واقعے کو بھی نظر انداز کر گئے، جو اقبال کو بمبئی کے ایک ہوٹل میں پیش آیا تھا اور جس کی تفصیل انھوں نے اخبارِ وطن لاہور کے مدیر مولوی انشاءاللہ خاں کے نام ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو عدن سے لکھی تھی۔ علامہ بتاتے ہیں:

> اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آ کر مقیم ہوا، جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بولتا تھا۔ مَیں نے ایک روز اس سے پوچھا: تم کہاں سے آئے ہو؟ بولا: چین سے آیا ہوں، لیکن چینی ہماری چیزیں نہیں خریدتے۔ مَیں نے سن کر کہا: ہم ہندیوں سے تو یہ افیمی ہی عقل مند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں۔ شاباش افیمیو، شاباش! نیند سے بیدار ہو جاؤ۔ ابھی تم آنکھیں مَل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے۔[۳۵]

اسی مکتوب میں داؤد رہبر کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ غیر مسلم مذاہب سے اقبال کی حقارت ان کی شاعرانہ عظمت کو زیب نہیں دیتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ مرحوم کی عظمت کا اعتراف غیر مسلم ملتوں میں اب تک ناپید ہے اور آئندہ بھی اس کا کم ہی امکان ہے۔[۳۶] ہمارے مراسلہ نگار غالباً کلامِ اقبال سے بہت دُور کا تعلق رکھتے ہیں، ورنہ کلامِ اقبال کے اوّلیں مجموعے میں ہندو اور

سکھ مذہب کے بانیوں، یعنی رام اور نانک کی توصیف میں نظمیں شامل ہیں، مزید یہ کہ لینن، مسولینی، کارل مارکس، آرنلڈ اور سوامی رام تیرتھ جیسے غیر کے لیے اقبال کی تحسینی نظمیں اقبال سے یادگار ہیں۔ جہاں تک غیر مسلموں کی طرف سے اقبال کی عظمت کو تسلیم نہ کرنے کی بات ہے تو محض سروجنی نائیڈو، سرکشن پرشاد شاد، سر تیج بہادر سپرو، راجندر پرشاد، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ، امراؤ سنگھ شیر گل، امرناتھ جھا، نکلسن، این میری شمل، میلکم ڈارلنگ اور دیگر بیسیوں غیر مسلم دانشوروں اور مغربی جامعات کے لاتعداد معلمین اور مفکرین اقبال کے خیالات سے آگہی کافی ہوگی۔

(۴)

مکتوباتِ مشاہیر میں اقبال سے متعلق ایک اہم موضوع ان کے اشعار کی تشریح ہے۔ چند اشعار کی تشریح ملاحظہ فرمائیے۔ اقبال کا ایک شعر ہے:

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد [۳۷]

(ترجمہ) اس طرح زندگی بسر کر اگر ہماری موت، مرگِ دوام ثابت ہو تو خالق کو بھی اپنی اس تخلیق پر افسوس ہو۔

مولانا غلام رسول مہر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> صاف وسادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایسے انداز میں زندگی بسر کرنی چاہیے، جس کے بعد اس کی موت مرگِ دوام نہ بنے اور اگر بنے تو یہ امر خالقِ حیات وموت کے لیے باعثِ شرمساری ہو۔ غالباً آخری مصرعے کی جسارت نے الجھن پیدا کی، حالانکہ یہ شاعرانہ استدلال ہے، جو منطقی اور فلسفیانہ استدلال سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ شاعر داعی ہوتا ہے، وہ عقلی دلائل کی بنا پر نہیں، بلکہ اپنے اختیار کردہ مقدمات کی بنا پر حقائق سامع کے دل میں اتارتا ہے۔ اقبال کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ انسان یا کہنا چاہیے مرضیاتِ باری تعالیٰ پر کاربند انسان کی موت مرگِ دوام ہو ہی نہیں سکتی، یہ ممکن ہی نہیں کہ اس حیات میں انقطاع پیدا ہو۔ یہاں کی زندگی ختم ہوتے ہی دوسری زندگی شروع ہو جاتی ہے، جیسے انسان ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا جائے۔ اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوتا تو موت وحیات کا پورا خانہ اللہ تعالیٰ کے لیے باعثِ ننگ مانا جاتا، حالانکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ زور پہلے مصرعے پر ہے، دوسرا مصرعہ ناممکن کو مبالغے سے ناممکن ثابت کرنے کے لیے کہا گیا ہے، یعنی حیات بعد الموت کا یقین دلانے کے لیے ایک ایسی صورت فرض کر لی گئی، جو کسی مسلمان یا کسی انسان کے لیے ممکن القبول نہیں۔ شاعر کے نزدیک متبادل صورت ممکن ہی نہیں، لہٰذا دوسرے مصرعے کی عملاً نوبت ہی نہ آئے گی۔ [۳۸]

۲؍جنوری ۱۹۶۴ء کو لکھے گئے ایک خط میں مولانا غلام رسول مہر نے اقبال کی ایک ترکیب 'سرودِ رفتہ' پر بحث کی ہے۔ ارمغانِ حجاز میں اقبال کا ایک قطعہ ہے:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟ نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید؟ [۳۹]

اس سلسلے میں فقیر سید وحید الدین کا مؤقف تھا کہ علامہ کے قطعے میں درست لفظ 'سرود' ہی ہے، جسے بعد کی اشاعتوں میں 'سرود' سے بدل دیا گیا۔ مولانا مہر اپنا نقطہ نظر پیش کرنے سے قبل اقبال کا درج ذیل شعر درج کرتے ہیں:

گوش ، آوازِ سرودِ رفتہ کا جویا ترا　　اور دِل ، ہنگامۂ حاضر سے بے پروا ترا[۴۰]

مہر لکھتے ہیں:

مجھے یاد ہے کہ چودھری محمد حسین مرحوم نے اقبال کی وفات کے بعد ارمغانِ حجاز چھاپنے کا قصد کیا تھا تو مجھ سے بھی پوچھا تھا۔ مَیں نے، جہاں تک مجھے یاد ہے، 'سرودِ رفتہ' کا حوالہ بھی دیا تھا، مگر سمجھا یہ گیا کہ گزرے ہوئے سرود کو فارسی 'سرودِ رفتہ' نہیں کہتے، لہٰذا 'سرود' بنایا گیا؛ مگر ہندی فارسی، ایرانی فارسی سے مختلف ہے۔ بانگِ درا کا جو شعر مَیں نے اوپر نقل کیا ہے، اس میں 'سرود' کو کیوں کر بدلیں گے، وہاں تو گوش موجود ہے، جس کے لیے 'سرود' بالکل بے تعلق ہوگا۔ غرض میرے نزدیک 'سرودِ رفتہ' ہی درست ہے۔[۴۱]

غلام رسول مہر نے اقبال کے مجموعۂ کلام ضربِ کلیم کی تشریح کی تو کتاب کے سرورق پر طبع اقبال کے یہ اشعار چھوڑ گئے:

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد　　ہَوائے سیر ، مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے　　خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر[۴۲]

۹ر جون ۱۹۶۴ء کے ایک خط میں اس کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

آزاد طبیعتیں ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھتیں، ترقی کی منازل میں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ہر طبیعت کو نسیم کی طرح ہوائے سیر پیدا کرنی چاہیے۔ حضرت موسیٰ نے ایک ضرب سے، عام روایت کے مطابق، بارہ چشمے پیدا کر لیے تھے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ضربِ کلیم انسان کے پاس ہو تو جو پتھر راستے میں رکاوٹ بن کر آئے، اس پر ضرب لگانے سے ہزار چشمے پھوٹ نکلیں، یعنی وہ بھی مزاحمِ سفر ہونے کے بجائے مؤیدِ سفر بن جائے۔[۴۳]

بارہ چشموں کے جاری ہونے والے واقعے کو مولانا نے 'عام روایت' قرار دیا ہے، حالانکہ اس واقعے کی طرف سورۂ بقرہ کی آیات ۵۷ اور ۶۰ میں ارشاد ملتا ہے۔ واضح رہے فرعون سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل کے لوگ وادیِ سینا میں داخل ہوئے۔ اس بے آب و گیاہ صحرا میں دھوپ کی شدت اور غذائی ضروریات کی عدم فراہمی کے باعث ہلاکتوں کا اندیشہ تھا۔ اللہ رب العزت نے ان پر بادل کا سایہ کر دیا اور کھانے کے لیے من و سلویٰ نازل کیا۔ پھر جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے (اللہ تعالیٰ سے) پانی کی درخواست کی تو ارشاد ہوا، اپنی لاٹھی پتھر پر مارو، (انھوں نے لاٹھی ماری) تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

علامہ اقبال کی ایک نظم بعنوان 'ایک فلسفہ زادہ سید زادے کے نام' ضربِ کلیم میں شامل ہے۔ شاعر اور شارح دونوں نے فلسفہ زدہ سید زادے کا نام اخفا میں رکھا۔ ایک موقع پر محمد عالم مختار حق نے اصرار کیا تو مولانا مہر نے بتایا کہ سید زادہ 'بخاری' تھے۔ [پطرس] بخاری مرحوم نے یہ واقعہ خود سالک مرحوم کو سنایا تھا، انھوں نے یہ ذکر مجھ سے کیا۔[۴۴]

مولانا مہر کے خیال میں کلامِ اقبال کی تعبیر و تشریح کی دو صورتیں ہیں:

اوّل یہ کہ ان کے کلام کو اسلام کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے، لیکن وہ عالم گیر اسلام، جو رسول اللہؐ اس دنیا میں لائے اور مقصود یہ تھا کہ دنیا اس پر کاربند ہو جائے۔ دوسری تعبیر و تشریح وہ ہے، جو ۱۹۴۷ء سے کچھ مدت پیشتر ہونے لگی اور اس میں، میرے علم کے مطابق، اسلام کے عالم گیر اصول کے بجائے اسے 'فرقہ وار' صورت دے دی گئی تھی۔ میرے علم کی حد تک، نہ علامہ ایسے اسلام کے کبھی قائل ہوئے اور نہ ان کے کلام کی

attachments\1-final.jpg not found.

attachments\2-final.jpg not found.

attachments\3-final.jpg not found.

attachments\5.jpg not found.

ایسی تعبیر وتشریح سودمند ہوسکتی ہے۔[۴۵]

دوسری جانب ۱۵/اپریل ۱۹۷۴ء کو ایک خط کے جواب میں ڈاکٹر سید عبداللہ تفہیم شعرِ اقبال کا ایک اصول بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> تشریح اقبال ایک اصول اور طریقِ کار کی متقاضی ہے۔ میری دانست میں اصول یہ ہے کہ جہاں مطلب واضح نہ ہو، وہاں اوّل: سیاق وسباق اور دوم: علامہ کے مجموعی فکر کی روشنی میں تشریح کرنی چاہیے۔ علامہ کے کلام میں فکری اشارے اور ادبی تلمیحات ادبیات وعلومِ اسلامیہ کی علمی وادبی روایت کے مطابق ہیں، ان پر عبور ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ علومِ جدید اور نظریاتِ جدید کے اشارے بھی بکثرت ملتے ہیں، ان کی معرفت کے لیے علومِ جدید کا علم وافی ہونا چاہیے۔[۴۶]

اسی خط میں انھوں نے .....آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا..... کے حوالے سے لکھا: اس میں شبہ نہیں کہ علامہ نے انقلابِ روس پر مسرت کا اظہار کیا، مگر اس کا باعث اشتراکی نظریہ نہ تھا۔ علامہ کی مسرت کا باعث فقط یہ تھا کہ روس نے مغرب کی استعماری طاقتوں (سرمایہ دارانہ جمہوریتوں) کے خلاف اس تازہ بغاوت کو محکوموں کے لیے پیغامِ آزادی خیال کیا۔[۴۷] سید صاحب لکھتے ہیں کہ مجموعی طور سے حضرتِ علامہ نے پوری احتیاط کرتے ہوئے، اشتراکیت کے نظریے سے ہر جگہ بے زاری اور لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔[۴۸] ان کے مطابق، ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء سے لے کر آخری ایامِ حیات تک اپنی شاعری، نثر اور مکاتیب میں سوشلزم، کمیونزم، بلکہ ہر 'ازم' کی مذمت کی ہے، کیونکہ ان کی رائے میں اسلام کے سوا ہر طریقہ، ہر نظام اور اسلوبِ حیات باطل ہے؛[۴۹] چنانچہ ان کے خیال میں، علامہ کے کلام میں سوشلزم کا پیوند اگر آیا بھی تو بغرضِ نفی آیا ہے، نہ بغرضِ تائید و تاکید۔[۵۰]

اقبال کے شعر:

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام　　وہ حضر بے برگ وساماں، وہ سفر بے سنگ ومیل[۵۱]

کی ترکیب 'بے سنگ ومیل' پر استفسار کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ کی الجھن یہ معلوم ہوتی ہے کہ 'سفر بے سنگ ومیل' کے بجائے 'سفر بے سنگِ میل' (بغیر واو عاطفہ) ہونا چاہیے اور عام خیال کے مطابق آپ کی تشویش بے جا بھی نہیں، کیونکہ نئی اردو میں 'سنگ میل' کی ترکیب آج کل مروّج ومقبول ہوگئی ہے اور مراد اس سے لی جاتی ہے وہ پتھر، جس پر راستے کے میلوں (یا فاصلے) کی نشان دہی کی جاتی ہے، بظاہر انگریزی کے milestone کا ترجمہ ہے اور چل رہا ہے۔[۵۲] اس کے بعد وہ فارسی اردو لغات سے اس لفظ کے مفاہیم پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بالکل نئے دَور میں، زیادہ تر علامہ کے اس شعر کے بعد کے زمانے میں، سنگِ میل کا رواج زیادہ ہوگیا ہے، جو صحیح یا غلط کی بحث سے قطع نظر محض milestone کا ترجمہ ہے اور فارسی یا اردو کے پرانے استعمال سے مختلف ہے، لہٰذا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ علامہ کے کلام میں 'بے سنگ ومیل' کی ترکیب بالکل صحیح ہے۔[۵۳]

اقبال نے جاوید نامہ میں 'زیارتِ امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی ومُلّا طاہر غنی کشمیری (آں سوے افلاک)' کے تحت لکھا تھا:

آں برہمن زادگانِ زندہ دِل　　لالۂ احمر ز رُوے شاں خجل
آں جواں کو شہر و دشت و در گرفت　　پرورش از شیرِ صد مادر گرفت[۵۴]

پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے اپنی کتاب اقبال اور کشمیر (مطبوعہ سری نگر) میں 'برہمن زادگان' سے موتی لعل اور

جواہر لعل اور شیخ عبداللہ مراد لیے۔ ردِعمل میں ۱۴؍جولائی ۱۹۷۸ء کے نوائے وقت لاہور میں ڈاکٹر انور محمود خالد کا ایک مضمون شائع ہوا تو جگن ناتھ آزاد نے ایک خط میں اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا:

'آں برہمن زادگانِ زندہ دِل' اور 'آں جواں کوشہر و دشت و در گرفت' میں اشارے کسی نہ کسی طرف تو ہیں نا؟ اور اشارے بھی مبہم نہیں، واضح۔ چلیے، ایک لمحے کے لیے مَیں فرض کر لیتا ہوں کہ میری توجیہ غلط ہے تو آخر کوئی صحیح توجیہ تو ہونی چاہیے۔ ان دو مصرعوں کا کوئی نہ کوئی مفہوم تو ہے یا یہ مہمل مصرعے ہیں؟ اگر مفہوم ہے تو وہ بیان کر دیا جائے۔ بڑے خلوص اور ایمان داری سے عرض کرتا ہوں کہ اگر قائل ہو جاؤں گا تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا۔ ۵۵

پروفیسر ظفر حجازی نے ایک خط میں ڈاکٹر سید عبداللہ سے اقبال کے دو اشعار سے متعلق استفسارات کیے۔ جن میں سے ایک شعر تھا:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے　　پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے ۵۶

پروفیسر ظفر حجازی کا کہنا تھا کہ 'فکرِ صبح گاہی' تو ایک پسندیدہ فعل ہے، اقبال اسے ایک زوال آمادہ عمل کی حیثیت سے کیوں پیش کرتے ہیں۔ ۱۷؍جنوری ۱۹۸۴ء کو لکھے گئے ایک خط میں سید عبداللہ لکھتے ہیں:

پہلا شعر نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' سے متعلق ہے، جہاں ابلیس مسلمانوں کو غافل رکھنے کی تدبیریں بتاتا ہے۔ ان میں سے ایک تدبیر یہ ہے کہ ان کے خانقاہی مزاج کو پختہ تر کرتے رہنا چاہیے، تاکہ وہ جہاد کی طرف مائل نہ ہو پائیں اور محض اوراد و وظائف میں (صوفیوں کے ذکر و فکر میں) لگے رہیں۔ ذکر و فکرِ مومنانہ بڑا بلند عمل ہے، جو خدا سے محبت کو پختہ کر کے ایک سرگرم عمل کردار پیدا کرتا ہے، بخلاف ذکر و فکرِ خانقاہی کے، جو جہاد اور عمل سے غافل رکھتا ہے۔ ۵۷

اس تشریح سے حجازی صاحب مطمئن نہ ہوئے تو سید عبداللہ نے ۷؍اپریل ۱۹۸۴ء کے خط میں اس طرح وضاحت کی:

ذکر و فکر کے سلسلے میں علامہ اقبال کے خیالات میں تضاد نہیں۔ جہاں وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ ذکر و فکر اور نالۂ سحر گاہی فقر کی شان ہے، وہاں وہ اس طریقِ کار کو مسترد کر دیتے ہیں کہ کوئی شخص ذکر و فکر سے یہ سمجھے کہ وہ جہدِ حیات سے بے نیاز ہو گیا۔ مکمل فقر دونوں کا تقاضا کرتا ہے اور یہی سچے تصوف کا لازمہ ہے۔ ۵۸

دوسرا شعر 'جوابِ شکوہ' کے پہلے بند سے تھا:

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا　　آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا ۵۹

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا:

دوسرا شعر 'جوابِ شکوہ' سے ہے، اس میں مدِنظر رہے کہ 'شکوہ' کی شوخیِ بیان پر کچھ اعتراض ہوئے تھے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ میری شوخیِ گفتار جذبۂ عشق کے زیرِ اثر تھی۔ جذبہ قوی ہو تو اس کے غیر معتدل ہونے کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ مَیں نے 'شکوہ' میں کچھ باتیں شوخ و بے باک انداز میں کہہ ڈالی تھیں، جو آزمائش کا محل بن سکتی تھیں، لیکن چونکہ میری فریاد دِل سے نکلی تھی، اس لیے..... آسمان چیر گیا نالۂ بے باک مرا..... جس سے آسمان کے مکین بھی متاثر اور حیران ہو گئے۔ ۶۰

سید عبداللہ کے خیال میں، اس شعر کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے 'شکوہ' بھی مدِنظر رہے اور 'جوابِ شکوہ' کے اس شعر سے

آگے اور پیچھے کے دس بارہ اشعار بھی زیرِ نظر رہیں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> الفاظ 'فتنہ گر'، 'سرکش' اور 'چالاک' وغیرہ عشق کے جذبۂ قوی کی صفات کے طور پر لائے گئے ہیں اور غیر معمولی جذبۂ عشق میں آزمائشیں سرکشی (جرأتِ رندانہ) اور جوش اور طوفانی کیفیات تو ہُوا ہی کرتی ہیں، ان میں بُرائی کا اظہار نہیں، 'غیر معمولی' پن کا اظہار ہے۔[۶۱]

اس کے باوجود سید صاحب واللہ اعلم بالصواب کہنے کی گنجائش محسوس کرتے ہیں۔

مجلّہ اقبال بابت جنوری اپریل ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر صابر کلوروی کا مضمون بعنوان 'علامہ اقبال کی ایک نظم موٹر' شائع ہوا، جس میں انھوں نے لکھا کہ موٹر میں جگندر سنگھ کے بجائے ان کا بیٹا جُت اندر سوار تھا اور موٹر کی خاموشی کے متعلق اسی نے بات کی تھی۔ ملک حق نواز خاں یکم اگست ۲۰۰۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> اقبال کی بانگِ درا کی بیاض مملوکہ اقبال میوزیم لاہور میں اس نظم کے ابتدائی متن میں بھی جُت اندر ہی موجود ہے، مَیں نے بانگِ درا کی پہلی اشاعت کا ناقص نسخہ میں بھی یہ مصرع یوں درج ہے..... کیسی پتے کی بات جُگ اندر نے کل کہی۔ قیاس چاہتا ہے کہ پرویں رقم مرحوم نے جگ اندر کے بجائے جُت اندر لکھا ہو گا۔ جب یہ فیصلہ ہوا کہ جگندر کا نام نظم میں آنا چاہیے نہ کہ جُت اندر کا تو اسے 'جُگ اندر' بنا دیا گیا۔ اگر یہ پس منظر ذہن میں نہ ہو تو 'جگ اندر' لکھنا سمجھ میں نہیں آتا۔[۶۲]

جنوری ۱۹۶۵ء میں اپنے ایک خط مہر لکھتے ہیں کہ صبح کے اقبال کا 'شکوہ' یاد آیا۔ دو بندوں نے مضطرب کر دیا۔ نماز کے بعد دفتر میں پہنچا، بانگِ درا نکال کر وہ دو بند بار بار پڑھے، پھر طبیعت تسکین پذیر ہوئی، یعنی:

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا
بُت گری پیشہ کیا؟ بُت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو ، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟
رسمِ سلمانؓ و اویسِ قرنیؓ کو چھوڑا؟
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں

عشق کی ، خیر ، وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے ، کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں ، تُو بھی تو ہرجائی ہے[۶۳]

مہر لکھتے ہیں:

> آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اقبال نے ان شعروں میں شاعری کے کتنے کمالات دِکھائے ہیں۔ بالکل سادہ شعر ہیں اور یہ 'شکوہ' ہے، یعنی وہ موقع، جب خدا سے شکایتیں کرنی ہیں۔ شکایتوں میں اپنی حالتِ زار پیش

کرنا ناگزیر تھا، مگر اس نباضِ فطرتِ انسانی نے ایک بھی شعر ایسا نہ کہا، جو افسردگی زا ہوتا۔ مسلمانوں کے بہترین کارنامے ایسے انداز میں پیش کیے کہ وہ شکوہ بن گئے۔ مندرجہ بالا اشعار ایسے مقام پر آئے ہیں، جہاں شکایت کرنے والے کا پہلو دبتا تھا۔ ضروری باتیں استفہامِ انکاری کی شکل میں پیش کر کے خدا سے کہہ دیا کہ آخر آپ بھی تو ہرجائی بن گئے۔ 'شکوہ' شکوہ بھی ہے، مسلمانوں کے بہترین کارناموں کا مرقع بھی، مسلمانوں کے لیے دعوتِ عمل بھی۔ جو نظم بیک وقت تین وظیفے انجام دے رہی ہے، اس کی عظمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟[۶۴]

حالی کے 'شکوۂ ہند' اور اقبال کے 'شکوہ' کا موازنہ کرتے ہوئے مہر نے مطالب بانگِ درا میں لکھا تھا:

خواجہ حالی کا 'شکوۂ ہند' پڑھنے کے بعد آج بھی ہر انسان پر افسردگی و پژمردگی طاری ہو جاتی ہے، جس سے قوم کے دِلوں اور حوصلوں پر اچھا اثر نہیں پڑتا؛ اس کے برعکس اقبال نے 'شکوہ' میں ایسا انداز اختیار کیا، جس میں مسلمانوں کے عظیم الشان حوصلہ افزا اور زندۂ جاوید کارنامے پیش کرنے پر اکتفا کی، لہٰذا اس نظم کے پڑھنے سے حوصلے بلند ہوتے ہیں، قوتِ عمل میں تازگی آتی ہے، جوش و ہمت کو تقویت پہنچتی ہے۔[۶۵]

(۵)

فقیر سید وحید الدین کی تصنیف روزگارِ فقیر شائع ہوئی تو مہر کو ان میں کئی غلطیاں نظر آئیں، البتہ مہر نے ان میں سے ایک کی نشان دہی کی ہے، لکھتے ہیں:

روزگارِ فقیر مَیں نے ایک مرتبہ سرسری نظر سے دیکھی تھی۔ اس میں تو کئی جگہ مجھے غلطیاں نظر آئیں۔ ایک اب تک حافظے میں تازہ ہے، مثلاً ۱۹۳۱ء میں حضرت علامہ کو ہسپانیہ پہنچایا گیا، حالانکہ اس سفر میں میرا ان کا ساتھ تھا۔ مَیں ہسپانیہ جانا چاہتا تھا، مگر ان کے ارشاد پر اپنا قصد چھوڑ کر رومہ ساتھ آیا اور وہاں سے ہندوستان پہنچے؛ البتہ ۱۹۳۲ء کے سفر میں وہ ہسپانیہ گئے اور اس سفر کی تفصیلات سے صاحبِ روزگارِ فقیر بالکل بے خبر ہیں۔[۶۶]

بشیر احمد ڈار کے خطوں سے ایک دلچسپ صورتِ حال سامنے آتی ہے، یعنی بعض نام نہاد اقبال شناس دوسروں کی تحقیق و جستجو کو بغیر کسی شکریے یا اظہارِ ممنونیت کے، اپنی محنت و کاوش کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بشیر احمد ڈار اور سید نذیر نیازی نے سید عبدالواحد معینی کی بعض ایسی ہی جسارتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ بشیر احمد ڈار ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

جہاں تک ماخذات کی کمی کا معاملہ ہے، اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ سید عبدالواحد [معینی] جیسے لوگ، دوسرے لوگوں کی محنت پر ڈاکا ڈالنے کے عادی ہیں اور پھر اس کو تسلیم کرنے سے بھی منکر۔ اگر آپ بالفرض انقلاب سے کوئی چیز بڑی محنت کے بعد معلوم کر کے شائع کرا دیں تو کچھ عرصے کے بعد یہی چیز انقلاب کے حوالے سے وہ خود کسی مجموعے میں شامل کر کے تمام سرخ رُوئی اپنے لیے مخصوص کر لیتے ہیں۔ ان کی اس حرکت سے بچنے کے لیے مَیں نے عملاً ان تمام ماخذات کو آخری مسودے سے حذف کر دیا تھا۔[۶۷]

سید عبدالواحد معینی کے مدوّن کردہ باقیاتِ اقبال (۱۹۵۲ء) کے بعد مولانا غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری نے اقبال کے مزید باقی کلام کو سرودِ رفتہ کے نام سے شائع کر دیا۔ محمد عبداللہ قریشی نے باقیاتِ اقبال کو ترمیم و اضافہ کے

بعد مرتب کیا تو اس میں سرودِ رفتہ کے معتد بہ حصے کو بغیر کسی حوالے یا شکریے کے شامل کر لیا۔ دلچسپ بات یہ کہ قریشی صاحب نے ان اسقام کو بھی دُور نہ کیا، جو سرودِ رفتہ میں در آئے تھے۔ مہر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس میں انھوں نے میری کتاب پیشِ نظر رکھ کر سب کچھ بدل دیا، لیکن بھائی! ایسے معاملات میں کیا کیا جا سکتا ہے؟ ہم نہ دعوے کر سکتے ہیں، نہ ایسے ہنگاموں کے لیے ہمارے پاس فرصت و وقت ہے۔ لوگ حدود کا خیال نہیں رکھتے، صبر کے سوا چارۂ کار کیا ہے؟[۶۹]

محمد عبداللہ قریشی نے اقبال بنام شاد (۱۹۸۶ء) میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر زور کے مرتبہ شاد اقبال (۱۹۴۲ء) کے تمام خطوط کو اپنے مجموعے میں شامل کیا، لیکن مرتب کے طور پر انھیں یکسر نظر انداز کر دیا۔

ڈاکٹر ممتاز حسن (۶/اگست ۱۹۰۷ء۔ ۲۸/اکتوبر ۱۹۷۴ء) ماہر اقتصادیات، بنکار، شاعر اور ادیب تھے۔ لیاقت علی خاں کے پرائیویٹ سیکرٹری، سٹیٹ بنک کے قائم مقام گورنر، نیشنل بنک کے مینیجنگ ڈائریکٹر، اقبال اکادمی پاکستان کے نائب صدر، مجلس نوادر قومی عجائب گھر کراچی، پاک ایران کلچرل ایسوسی ایشن اور اردو ترقیاتی بورڈ کے صدور رہے۔ مشفق خواجہ کے بقول، جب وہ برسرِ اقتدار تھے تو ادیبوں کو انھوں نے اتنے فائدے پہنچائے اور ایسے طریقوں سے کہ حیرت ہوتی ہے۔[۶۸] مشفق خواجہ کو ان سے بہت محبت تھی۔ خواجہ صاحب سمجھتے تھے کہ زندگی میں جو دو چار بہترین انسان دیکھے ہیں میں سے ایک تھے، اسی لیے وہ ان کے علمی و ادبی کام محفوظ کرنے کی جستجو کرتے رہتے تھے۔ ممتاز حسن سے متعلق انھوں نے ۷/نومبر ۱۹۹۵ء کے ایک خط میں ایک عبرت انگیز واقعہ قلم بند کیا۔ لکھتے ہیں:

> مرحوم کے پاس اقبال سے متعلق نوادر کی پوری ایک الماری تھی۔ علامہ کے ایک سو سے زیادہ خط انھوں نے اِدھر اُدھر سے جمع کیے۔ ایما ویگے ناسٹ کے نام سے اصل خط بھی ان میں شامل تھے۔ علامہ کی تمام تصانیف کے کئی کئی دستخطی نسخے تھے، چند نادر تصویریں تھیں، یہ سب چیزیں ضائع ہو گئیں۔ ہُوا یہ کہ وہ جس مکان میں رہتے تھے، اُس پر بنگ کا قرض تھا۔ ان کے انتقال کے بعد مکان کی قرقی عمل میں آئی۔ تمام سامان باہر نکال دیا گیا، جو کئی دِن باہر پڑا رہا۔ نوادرِ اقبال والی الماری کوئی چوری کر کے لے گیا، اَور بھی بہت سے بیش قیمت کاغذات ضائع ہو گئے۔[۷۰]

(۷)

اقبالیات کے محققین و ناقدین بالعموم روایتی ذرائع سے استفادہ کرتے رہے ہیں، لیکن درج بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اقبال پر کام کرتے ہوئے ان بنیادی مصادر کے ساتھ ساتھ مشاہیر کے خطوط کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ آرا چونکہ منتشر اور غیر مرتب و غیر مربوط ہیں، چنانچہ ان سے اکتساب کی کوشش بھی بہت کم کی گئی ہے۔ ایسے مکتوبات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اقبالیات کے بعض ایسے پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے، جن پر مضامین یا تصانیف خاموش ہیں اور جن کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریری اعتبار سے بالعموم نہایت احتیاط کی جاتی ہے۔

والہ جات

۱۔ مولانا غلام رسول مہر بنام محمد عالم مختارِحق، مرقومہ بعداز ۲۸/اپریل ۱۹۶۴ء، مشمولہ گنجینۂ مہر اوّل، مرتبہ محمد عالم مختارِحق۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۸ء۔ ص ۱۸۹

۲۔ پروفیسر آلِ احمد سرور بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۴/ستمبر ۱۹۷۸ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ ڈاکٹر خالد ندیم۔ راول پنڈی: الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔ ص ۱۱۴

۳۔ عظیم حسین: *Sir Fazl-i-Hussain:A Political Biography*۔ ص ۳۱۸

۴۔ ڈاکٹر جاوید اقبال: زندہ رُود۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان + سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء دوم۔ ص ۳۷۲

۵۔ پروفیسر آلِ احمد سرور بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۴/ستمبر ۱۹۷۸ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۱۱۵

۶۔ حکیم عبدالکریم ثمر بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۲۶/ربیع الاوّل ۱۳۹۹ھ، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۱۲۷

۷۔ احمد رضا خاں بریلوی: حدائقِ بخشش۔ لاہور: خزینۂ علم و ادب، ۱۹۹۶ء

۸۔ ایضاً۔ ص ۱۲۸

۹۔ مولانا غلام رسول مہر بنام محمد عالم مختارِحق،: مرقومہ مابعد ۲۸/اپریل ۱۹۸۹ء، مشمولہ گنجینۂ مہر اوّل۔ ص ۱۸۹

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ علامہ محمد اقبال بنام سر اکبر حیدری، مرقومہ ۱۳/جون ۱۹۳۷ء، مشمولہ *The Letters of iqbal* مرتبہ بشیر احمد ڈار۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعتِ دوم ۲۰۰۵ء۔ ص ۲۰۵-۲۰۶

۱۲۔ پروفیسر آلِ احمد سرور بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۴/ستمبر ۱۹۷۸ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۱۱۴-۱۱۵

۱۳۔ مولانا غلام رسول مہر بنام محمد عالم مختارِحق، مشمولہ گنجینۂ مہر اوّل۔ ص ۱۰

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۱۵/جنوری ۱۹۸۳ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۸۱

۱۷۔ مولانا غلام رسول مہر: 'عظمت موت کے دروازے پر'، مشمولہ اقبال نامہ مرتبۂ چراغ حسن حسرت۔ لاہور: تاج کمپنی، س ن۔ ص ۵۵

۱۸۔ رشید حسن خاں بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۳۱/جولائی ۲۰۰۵ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۲۱۷

۱۹۔ ایضاً۔ ص ۲۱۹

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ ڈاکٹر خلیق انجم بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۱۲/اگست ۲۰۰۵ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۲۳۸-۲۳۹

۲۲۔ رشید حسن خاں بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۱۲/ستمبر ۲۰۰۵ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۲۲۱

۲۳۔ ڈاکٹر صابر کلوروی بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۳/اگست ۱۹۸۲ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۱۴۰

۲۴ علامہ محمد اقبال بنام مولوی عبدالحق، مرقومہ ۹ ستمبر ۱۹۳۷ء، مشمولہ اقبال اور عبدالحق مرتبہ ڈاکٹر ممتاز حسن۔ لاہور: مجلس ترقی ادب۔ ص ۴۹

۲۵ ڈاکٹر جاوید اقبال بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۴/اکتوبر ۱۹۷۶ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۱۴۰

۲۶ علامہ محمد اقبال بنام میجر سعید محمد خاں، مرقومہ مابین ۱۹۲۹ء-۱۹۳۰ء، مشمولہ Letter of Iqbal مرتبہ بشیر احمد ڈار۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعتِ دوم ۲۰۰۵ء۔ ص ۱۶۳

۲۷ علامہ محمد اقبال بنام میجر سعید محمد خاں، مرقومہ محولہ بالا، مشمولہ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد سوم)۔ دہلی: اردو اکادمی، اشاعتِ دوم ۱۹۹۹ء۔ ص ۵۲

۲۸ ڈاکٹر جاوید اقبال بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۹ جنوری ۲۰۰۹ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۵۸

۲۹ ایضاً

۳۰ ملک حق نواز خاں بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ یکم دسمبر ۲۰۰۳ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۲۳۱، ۲۳۲

۳۱ ڈاکٹر داؤد رہبر بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۲ فروری ۲۰۰۹ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۲۴۷

۳۲ ایضاً۔ ص ۲۴۸

۳۳ ایضاً

۳۴ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۴۵۱

۳۵ علامہ محمد اقبال بنام مولوی انشاءاللہ خاں، مرقومہ ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء، بحوالہ اقبال نامہ (یکجا) مرتبہ شیخ عطاءاللہ۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۵ء۔ ص ۵۲-۵۳

۳۶ ڈاکٹر داؤد رہبر بنام رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۲ فروری ۲۰۰۹ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ ص ۲۴۸

۳۷ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال فارسی۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۰ء و مابعد۔ ص ۴۷۶

۳۸ مولانا غلام رسول مہر بنام محمد عالم مختارِ حق، مرقومہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۳ء، مشمولہ گنجینۂ مہر اوّل۔ ص ۱۴۹-۱۵۰

۳۹ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال فارسی۔ ص ۸۹۴

۴۰ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۲۲۳

۴۱ مولانا غلام رسول مہر بنام محمد عالم مختارِ حق، مرقومہ ۲ جنوری ۱۹۶۴ء، مشمولہ گنجینۂ مہر اوّل۔ ص ۱۶۶

۴۲ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۵۰۳

۴۳ مولانا غلام رسول مہر بنام محمد عالم مختارِ حق، مرقومہ ۹ جون ۱۹۶۴ء، مشمولہ گنجینۂ مہر اوّل۔ ص ۱۹۰

۴۴ ایضاً۔ ص ۱۹۱

۴۵ ایضاً۔ ص ۲۱۵

۴۶ ڈاکٹر سید عبداللہ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۱۵/اپریل ۱۹۷۴ء، مشمولہ علامہ اقبال: مسائل و مباحث۔ مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء۔ ص ۳۱۸

۴۷ ایضاً

۴۸ ایضاً۔ ص ۳۱۹

۴۹ ایضاً
۵۰ ایضاً۔ص۳۱۸
۵۱ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو۔ص۲۸۶
۵۲ ڈاکٹر سید عبداللہ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۱۵/اپریل ۱۹۷۴ء، مشمولہ علامہ اقبال: مسائل و مباحث۔ص۳۲۰
۵۳ ایضاً۔ص۳۲۱
۵۴ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال فارسی۔ص۵۳۷
۵۵ پروفیسر جگن ناتھ آزاد بنام رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۲۴/اگست ۱۹۷۸ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ص۶۸
۵۶ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو۔ص۱۲۷
۵۷ ڈاکٹر سید عبداللہ بنام پروفیسر ظفر حجازی، مرقومہ ۱۷/جنوری ۱۹۸۴ء، مشمولہ علامہ اقبال: مسائل و مباحث۔ص۳۲۳
۵۸ ڈاکٹر سید عبداللہ بنام پروفیسر ظفر حجازی، مرقومہ ۷/اپریل ۱۹۸۴ء، مشمولہ علامہ اقبال: مسائل و مباحث۔ص۳۲۵
۵۹ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو۔ص۲۲۷
۶۰ ڈاکٹر سید عبداللہ بنام پروفیسر ظفر حجازی، مرقومہ ۱۷/جنوری ۱۹۸۴ء، مشمولہ علامہ اقبال: مسائل و مباحث۔ص۳۲۳
۶۱ ایضاً۔ص۳۲۴
۶۲ ملک حق نواز خاں بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ یکم دسمبر ۲۰۰۳ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ص۲۳۴
۶۳ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو۔ص۱۹۶
۶۴ مولانا غلام رسول مہر بنام محمد عالم مختارِ حق، مرقومہ مابعد ۸ دسمبر ۱۹۶۴ء، مشمولہ گنجینۂ مہر اوّل۔ص۲۳۱
۶۵ مولانا غلام رسول مہر: مطالبِ بانگِ درا۔لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن۔ص۲۷۰
۶۶ مولانا غلام رسول مہر: گنجینۂ مہر اوّل۔ص۱۸۶
۶۷ بشیر احمد ڈار بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۲۰/دسمبر ۱۹۷۲ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ص۲۸
۶۸ مولانا غلام رسول مہر بنام محمد عالم مختارِ حق، مرقومہ ۲۷/مئی ۱۹۶۷ء، مشمولہ گنجینۂ مہر دوم، مرتبہ محمد عالم مختارِ حق۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۸ء۔ص۴۵
۶۹ مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۲۰/دسمبر ۱۹۷۲ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ص۱۴۵
۷۰ مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرقومہ ۷/نومبر ۱۹۹۵ء، مشمولہ اقبالیاتی مکاتیب۔ص۱۴۸

کتابیات:

- احمد رضا خاں بریلوی: حدائقِ بخشش۔لاہور: خزینۂ علم و ادب، ۱۹۹۶ء
- اقبال، علامہ محمد: کلیاتِ اقبال اردو۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء و مابعد

- اقبال، علامہ محمد: کلیاتِ اقبال فارسی۔لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۰ء و مابعد
- بشیر احمد ڈار (مرتب): The Letters of iqbal۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعتِ دوم ۲۰۰۵ء
- جاوید اقبال، ڈاکٹر: زندہ رُود۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء (دوم)
- چراغ حسن حسرت (مرتب): اقبال نامہ۔لاہور: تاج کمپنی، س ن
- خالد ندیم، ڈاکٹر (مرتب): اقبالیاتی مکاتیب بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔راول پنڈی: الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء
- رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: علامہ اقبال، شخصیت اور فکر و فن۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۰ء (دوم)
- سید عبداللہ، ڈاکٹر: علامہ اقبال: مسائل و مباحث (مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء
- عطاء اللہ، شیخ (مرتب): اقبال نامہ (یک جلدی)۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۵ء
- محمد عالم مختارِ حق (مرتب): گنجینۂ مہر (اوّل، دوم)۔لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۸ء
- مظفر حسین برنی، سید (مرتب): کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد سوم)۔دہلی: اردو اکادمی، اشاعتِ دوم ۱۹۹۹ء
- ممتاز حسن، ڈاکٹر (مرتب): اقبال اور عبدالحق۔لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعتِ دوم ۲۰۰۸ء
- مہر، مولانا غلام رسول: مطالبِ بانگِ درا۔لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن